شبلی نعمانی اور ظفر علی خان

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

ABSTRACT:

Molana Muhammad Shibli Nomani (4 June 1857…. 18 November 1914) and Molana Zafar Ali Khan (January 1873…. 27 November 1956) are great literary figures of Muslim sub continent. This article deals with their relations and unfolds the facts that Zafar Ali Khan was a student of Molana Shibli Nomani, who attended his lectures at Ali Garh in B.A classes. He composed poetry in the praise of his teacher and translated his works in English, both prose and poetic. During their stay in Hyderabad Deccan state they enjoyed company of each other as well.

Keywords: Shibli , Zafar Ali Khan, Ali Garh, Haiderabad, Kan pur, translations, Turks

شمس العلما مولانا محمد شبلی نعمانی (۴؍جون ۱۸۵۷ء......۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء) علی گڑھ کالج کا مایہ افتخار ہیں۔ وہ فروری ۱۸۸۳ء سے اواخر ۱۸۹۸ء تک اس تاریخی درس گاہ سے وابستہ رہے۔ وہ یہاں عربی کے استاد اور طلبا کی ادبی تربیت کے لیے قائم کی گئی مجلس **لجنة الادب** کے نگران تھے۔ کم و بیش سولہ سال کی اس مدت میں انھوں نے بہت سی جماعتوں کو درس دیا اور کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری کی۔ علی گڑھ میں ان کے دامن تربیت اور خوانِ علم و فضل سے وابستہ رہنے والوں میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولوی عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین، مولوی عبدالحق، سید محفوظ علی بدایونی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور چودھری خوشی محمد ناظر جیسے لوگ شامل ہیں۔ اس سلسلۃ الذہب میں مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳ء......۱۹۵۶ء) کا نام بھی شامل ہے [۱] بلکہ کہنا چاہیے کہ مولانا شبلی کے تلامذہ میں قومی سطح پر خدمات انجام دینے والوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ظفر علی خان ۱۸۹۲ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ میں داخل ہوئے اور انھوں نے ۱۸۹۵ء میں فسٹ ڈویژن میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔

اس دوسالہ قیام کے دوران میں ظفر علی خان کو شبلی کے علم و فضل اور ان کی شخصیت سے کسب فیض کے خوب مواقع ملے۔ ''مولانا شبلی غضب کے مردم شناس تھے وہ عام طلبہ پر ضرورت سے زیادہ توجہ نہ دیتے لیکن جن طلبہ میں علمی صلاحیت پاتے وہ التفات خصوصی کے حق دار ٹھہرتے انھیں تحریر و تقریر کی مشق کراتے، تحقیق کی رغبت دلاتے ......'' ۲؎ ظفر علی خان بھی ان طالب علموں میں سے تھے جنھیں مولانا شبلی کی خاص توجہ حاصل رہی اسی لیے انھیں مولانا شبلی کے '' مخصوص تلامذہ'' ۳؎ میں شمار کیا جاتا ہے اس زمانے میں مولانا شبلی کا درس قرآن مشہور تھا۔ ظفر علی خان ان کے درس میں شریک ہونے والوں میں بھی شامل تھے۴؎ اس درس سے اثر پذیری کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مولانا شبلی کو خداوند کریم نے لحن داؤدی سے نوازا تھا وہ جب قرآن کی تلاوت کرتے تو گویا قلوب کو مسخر کرلیا کرتے تھے۵؎ ظفر علی خان نے اس دوران میں جہاں علمی اعتبار سے مولانا شبلی سے اکتسابِ فیض کیا وہاں تقریر و تحریر میں بھی مولانا نے ان کی شخصیت پر اثرات مرتب کیے۔ ظفر علی خان ایک طالب علم کی حیثیت سے **لجنۃ الادب** کے رکن تھے اور مولانا شبلی **لجنۃ الادب** کے نگران کی حیثیت سے طالب علموں کو تقریر و تحریر کا ملکہ سکھاتے تھے۔ اس تعلق کے بہت دوررس نتائج نکلے۔ ظفر علی خان کی شخصیت اور ان کے فن نے اس تجربے سے گہرے اثرات قبول کیے۔ ظفر علی خان کے مضامین اور اسلوب پر بھی شبلی کا اثر محسوس کیا جاسکتا ہے شبلی کی علمی تحریریں الگ انداز کی حامل ہیں البتہ عصری سیاسی مسائل پر ان کا انداز کہیں کہیں ظفر علی خان کے ہاں بھی دکھائی دے جاتا ہے اور شبلی کی طرح ظفر علی خان کی نثر میں بھی خطیبانہ لہجہ اور شاعرانہ اسلوب دکھائی دیتا ہے۔ یہ اثر پذیری نثر تک محدود نہیں بلکہ شاعری کی دنیا تک پھیلی ہوئی ہے۔ ظفر علی خان کے ہاں قومی شاعری کا جو رنگ روپ دکھائی دیتا ہے اس پر بھی شبلی کے اثرات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ظفر علی خان سے پہلے شبلی ہی تھے جنھوں نے عصری سیاسی حالات و واقعات کو شعر کا پیراہن عطا کیا اور اس موثر ذریعہ ابلاغ کو قومی جذبات کی بیداری کے لیے استعمال کیا **کلیات شبلی** کی سیر ہمارے اس دعوے کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کردیتی ہے۔ یوں تو اپنے والد کے زیر اثر ظفر علی خان کی بنیادی تربیت ہی میں قومی خدمت کا جذبہ شامل تھا لیکن علی گڑھ کی فضا نے اس جذبے کو خوب چمکایا اور اس میں جہاں سرسید کے پیدا کردہ ماحول کا اثر تھا وہاں ظفر علی خان کے استاد گرامی مولانا شبلی نعمانی کا فیضان بھی تھا۔ نوجوانی اور طالب علمی کے زمانے میں ظفر علی خان نے کچھ عاشقانہ غزلیں کہیں تو استاد گرامی نے ان کی حوصلہ شکنی کی۔ ظفر علی خان کی اپنی طبیعت بھی تنگنائے غزل سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتی تھی اس پر استاد کی ہدایت مستزاد ہوئی۔ انھوں نے فروری ۱۹۲۸ء کی ایک ریڈیائی تقریر میں اس بیتے زمانے کی بازآفرینی کرتے ہوئے بتایا

> ''مجھے خوب یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ جب میں نے ایک طرحی غزل کہی جو لکھنو کے ایک گلدستہ میں چھپ گئی اور استاذی شبلی مرحوم کی نظر سے گزری تو مرحوم نے مجھے سختی سے ڈانٹا اور فرمایا کہ آئندہ اس قسم کی خرافات کا سلسلہ جاری رکھا تو جماعت میں نہ آنے دیا جائے گا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میں نے عاشقانہ غزل سرائی سے توبہ کرلی اور نظم میں اظہار خیالات کا ایک نیا رستہ تجویز کرلیا جس کا نقشہ سالہا سال بعد میں نے یوں کھینچا............'' ۶؎

شبلی ایک محبوب استاد تھے ان کا انداز تدریس طالب علموں کو اپنی جانب متوجہ کر لینے والا تھا وہ ''شاعر، ادیب اور مورخ تھے ان کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہوتا تھا موقع موقع سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف سنا کر تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا'' ۷ ایسے استاد کی بات طالب علموں پر زیادہ اثر کرتی ہے اور پھر جب اس کے پیچھے جذبے کا چراغ بھی روشن ہو تو بات کی تاثیر اور بڑھ جاتی ہے ۔ ایسا ہی ہوا اور ظفر علی خان تاریخی، اخلاقی اور سیاسی موضوعات کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس میں اس قدر ریاض کیا کہ اب سیاسی ،تاریخی اور اخلاقی شاعری کی تاریخ ظفر علی خان کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ، یہی استاد گرامی کی خواہش تھی۔

خود شبلی کے ہاں قومی شاعری کا ظہور علی گڑھ کے ماحول کے زیر اثر ہوا، علی گڑھ جانے سے پہلے وہ قدیم خیالات کے شخص تھے اور بہ قول خود'' حرف بہ اردو زدن آئین نہ بود'' ان کا دستور تھا اس دور میں وہ تسنیم تخلص کرتے تھے اور رواجِ عام کے مطابق عشقیہ شاعری کو پسند کرتے تھے'' لیکن علی گڑھ آنے کے بعد ان کی شاعری کا محور بدل گیا اور غزلوں کی جگہ قومی نظموں نے لے لی'' ۸ قیام علی گڑھ کے زمانے میں انھوں نے تین چار سے زیادہ غزلیں نہیں کہیں وہ بھی محض ہیئت کی حد تک غزلیں ہیں زیادہ توجہ مثنوی مسدس اور قصیدے کی طرف رہی چنانچہ علی گڑھ میں ان کا اپنے شاگرد کو قومی شاعری کی طرف متوجہ کرنا قابلِ فہم ہے ۔دل چسپ بات یہ ہے کہ جب شبلی حیدرآباد چلے گئے تو ''دکن کے کیف آور ماحول میں ان کا ابتدائی ذوق پھر ابھر آیا اور انھوں نے اردو غزلیں لکھیں افسوس کہ یہ غزلیں محفوظ نہیں رہیں'' ایک خط میں نقل کیے جانے والے کچھ اشعار سے ان کے رنگ ڈھنگ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۹ ۔واضح رہے کہ یہ بات محض اردو کلام کی ہو رہی ہے فارسی شاعری میں تو شبلی کا تغزل مسلسل روز افزوں رہا۔ادھر شاگردِ عزیز ظفر علی خان تھے کہ انھوں نے غزل کو ایسا چھوڑا کہ پھر اس کا نام تک نہ لیا حیدرآباد کے زمانے میں ان کی اکا دکا غزل دکن ریویو کے صفحات پر ابھری لیکن شاعر کے نام کے اخفا کے ساتھ ۱۰

سر دست بابِ غزل میں داخلہ مقصود نہیں، ذکر ہے علی گڑھ میں ظفر علی خان کی طالب علمی کا......روم و مصر و شام کے سفر کے دوران جب ترکی حکومت نے مولانا شبلی کو تمغۂ مجیدی عطا کیا تو واپسی پر ہندوستان کی برطانوی حکومت نے مولانا شبلی نعمانی کو شمس العلما کا خطاب دینے کا اعلان کیا اس مناسبت سے علی گڑھ کالج میں ۱۹ر جنوری ۱۸۹۴ء کو ایک تہنیتی جلسہ ہوا جس میں کالج کے اکابر سر سید احمد خان ،سید محمود،نواب محسن الملک ،مولانا حالی،مولوی نذیر احمد،نواب مزمل اللہ خان، پروفیسر آرنلڈ ،سید کرامت حسین نے خطاب کیا۔ مولانا حالی،مولانا حمید الدین فراہی اور مولوی بہادر علی نے عربی قصائد پیش کیے ۔ظفر علی خان نے اس مجلس میں اپنے جلیل القدر استاد کی عظمت کا منظوم اعتراف کرتے ہوئے فارسی قصیدہ پیش کیا اگرچہ یہ قصیدہ ان کے دور طالب علمی کی تصنیفات سے ہے لیکن بہ قول سید سلیمان ندوی ''سالی کہ نکوست از بہارش پیداست'' کا مظہر ہے ۱۱

سحر گاہاں دلم پامالِ غم بود و پریشانی مکدر مطلع خاطر بُد از اندوہِ پنہانی
گہی بر بی سر و سامانیِ خود نالہ می کردم گہی خواندم حدیثِ گردشِ ایامِ طولانی

گہی بر کردۂ خود انفعالم دست می دادی | گہی کردہ نظر بر معصیت خوردم پشیمانی
چو موجِ غم ز سر بگزشت گشتم عازمِ گلشن | کہ درمانِ دلِ زارم شود زان سان بہ آسانی
شگفتہ غنچۂ دل شد ز فرطِ فرحت و بہجت | عروسِ دہر را پیرایۂ دیدم چو نورانی
گل و بلبل بہم محوِ ادا و عشوہ و غمزہ | چو زلفِ مہ و شاں گیسوی سنبل در پریشانی
خرامِ ناز کبک و رقصِ سرو و خندۂ گل ہا | دلم برد و شدہ روحم نثارِ صنع یزدانی
دمیدہ لالۂ حمرا کنارِ جویِ کوثر وش | ہمی شد از جمالش غرقِ خوں، لعلِ بدخشانی
وزید از گلستان بادِ صبا آہستہ آہستہ | مشامِ جان معطر شد ز بوی مستِ ریحانی
گلاب و نسترن، شببو و نسرین، نرگس و سوسن | بہر یک عشوۂ خاصی بد از انداز ارزانی
ز شبنم لالہ داغِ خود بہ اندازِ نکو شستہ | شمیم یاسمین و یاسمن در عنبر افشانی
ہزاران مرغِ خوش الحان نشستہ بر سرِ اغصان | بصوتِ دلربا بودند محوِ تہنیت خوانی
مہِ نو کشتیِ بہرِ نثار از نقرہ پُر کردہ | کواکب بر فلک مصروف ہر سو در دُر افشانی
چو این نظارہ را دیدم بہ جیبِ فکر سر بردم | کہ بہرِ کیست این آرائش و تزئینِ لاثانی
درین اثنا مرا از ہاتفِ غیبی ندا آمد | نمی دانی مگر تو ای غریقِ بحرِ حیرانی
کہ فخرِ قوم مولانای شبلی را پیِ علمش | خطابی شد عطا واللہ ز فیضِ جُودِ سلطانی
زمین ہم آسمان ہم چہرہ افروزند بہر او | معطر باغِ دہر است از پیِ شبلیِ نعمانی
بحمد اللہ کہ دُرِّ درجِ حکمت را پس از عمرے | ز عدلِ خسروی شد گرم بازارِ درخشانی
نہ یارایِ ثنای تو قلم را نی زبانم را | قطار عالمان انجم، میانش شمس تابانی
کنند ای کانِ معنی علم و فضل و دانش و حکمت | بیک پا ایستادہ بر جنابت پاستان بانی
زمینِ شعر از فیضت پر از گلہایِ بوقلموں | سخن را دادہ ای سرمایہ، ای بحرِ سخن دانی
کند پہنایِ مضمونِ لطیف و خوش بیک دم طی | سمندِ کلکِ تو ہر گہ شود سر گرم جولانی
براتی دادہ ای از فکر خود عرفی و صائب را | کجا ہم پایہ ات باشند خاقانی و قا آنی
بہاران نفحۂ باشد ز گلزارِ کمال تو | ز بہرِ عقل و فہمت رشحۂ ابریست نیسانی
خداوندِ کریمت لحنِ داؤدی عطا کردہ | کنی تسخیر دل ہا چو کنی ترتیل قرآنی
نوایِ نغمہ ہای شکرین تا خیزد از گلبن | صدائے بلبل آید تا ز شاخِ سروِ بستانی

ز چشمِ زخمِ دوران در سلامت باشی و ایمن
معین و یاور و ناصر ترا تائیدِ ربانی

علی گڑھ میں تعلیم کی تکمیل کے بعد ظفرعلی خان کو ملازمت کی ضرورت تھی۔ انگریز کی ملازمت وہ کرنا نہیں چاہتے تھے یوں بھی اس کا تجربہ انھیں اپنے والد کے ساتھ محکمہ ڈاک میں کچھ وقت گزار کر ہو گیا تھا۔ ان کی اس مشکل کو مولانا شبلی

نعمانی نے حل کیا۔ نواب محسن الملک (۹/دسمبر۱۸۳۷ء......۱۶/اکتوبر۱۹۰۷ء) کو انگریزی خط کتابت اور اپنے دوسرے علمی منصوبوں کے لیے کسی معاون کی ضرورت تھی ، پہلے خواجہ غلام الثقلین (م:۳۰/ستمبر۱۹۱۵ء)ان کی یہ خدمت انجام دیتے رہے تھے ۔ایک نئے گریجوایٹ اور باصلاحیت نوجوان کے طور پراب ظفرعلی خان ،ان کے لیے بہترین انتخاب ہوسکتے تھے ۔مولانا شبلی نے اس مقصد کے لیے اپنے لائق شاگرد کا نام تجویز کیا اور ظفرعلی خان ان کی اس تجویز پر نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکریٹری مقرر ہوگئے ۔ یہ تعلق ان کی علمی زندگی کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کرگیا اور انھوں نے یہاں رہ کر صرف نواب محسن الملک ہی کی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کی خدمت انجام دی۔ نواب محسن الملک انگریزی تحقیقات اور نئے فن پاروں کو اردو میں منتقل کروانے کے شائق تھے چنانچہ ان کے ایما پر ظفرعلی خان نے جہاں ان کے ذاتی معاون کے طور پر خدمت انجام دی اوران کے لیے فلسفے کے مضامین کا اردو ترجمہ کرتے رہے وہاں انھوں نے سائنس اور مذہب کے موازنے پر مشتمل جان ولیم ڈریپر کی مشہور کتاب ۱۲ کا اردو ترجمہ **معرکہ مذہب و سائنس** کے نام سے کیا۔نواب صاحب کی علمی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے ظفرعلی خان نے اس کتاب کے انتساب میں لکھا کہ محسن الملک کا ''نام مسلمانان ہند کی تاریخ میں آب زر سے لکھا جاچکا ہے''،انھی کی ''تحریک پر میں نے آج سے پندرہ سال پہلے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا تھا''۔۱۳

یہ وہ زمانہ تھا جب شبلی خود ریاست حیدرآباد سے وابستہ ہوچکے تھے۔ ایک بار وہ حیدرآباد سے بمبئی آئے تو انھوں نے ظفرعلی خان کو بھی حیدرآباد آنے کا مشورہ دیا۔نواب محسن الملک نے بھی تائید کردی ،ادھر ظفرعلی خان خود انگریزی ملازمت سے نفور اور کسی مسلم ریاست میں جا کر قسمت آزمائی کرنے کے خواہش مند تھے گویا یہ تو پہلے ہی ان کے دل میں تھا۔وہ اس مشورے پر فوراً ہی عمل پیرا ہوگئے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ظفرعلی خان لکھتے ہیں:

> ''بی اے کے امتحان سے فارغ ہوکر میں سیدھا نواب محسن الملک مرحوم کے پاس بمبئی چلا گیا جنھیں خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی علیحدگی کے بعد ایک پرائیویٹ سیکریٹری کی ضرورت تھی ان علمی مشاغل کے لیے جن کے ساتھ مجھے آج تک دل بستگی ہے میں محسن الملک علیہ الرحمہ ہی کے فیضِ تربیت کا رہینِ احسان ہوں ،ایک سال اس طور پر گزاراتھا کہ استاذی و ملاذی علامہ شبلی مغفور سفر حیدرآباد سے واپسی پر بمبئی ٹھہرے اور مجھے حیدرآباد جا کر قسمت آزمائی کرنے کی صلاح دی یہ عین میرے دل کا مدعا تھا......''۱۴

یہاں سے ظفرعلی خان کی علمی و عملی زندگی کا ایک اہم دور شروع ہوتا ہے۔ وہ شبلی کی تجویز اور محسن الملک کی سفارش پر حیدرآباد پہنچ جاتے ہیں شبلی ۱۸۹۹ء میں یہاں آچکے تھے اب ظفرعلی خان کو ایک بار پھر اپنے اس آئیڈیل استاد کی صحبت اور راہ نمائی میسر آ گئی اس پر اظہار مسرت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ہم حیدرآباد میں ''شبلی جیسے وحیدالعصر و یکتائے زمن کے خرمنِ فیوض سے خوشہ چینی کررہے ہیں اور حالی کی عدیم النظیر سخنوری و سخن سنجی سے مذاقِ سلیم کو بہرہ اندوز بنارہے ہیں'' ۱۵ ظفرعلی خان کی زندگی کا یہ زمانہ ہم مذاقوں اور دوستوں کی صحبت کے باعث کس قدر خوش کن اور پرثروت گزرا اس کا اندازہ اس کیفیت سے لگایا جاسکتا ہے جس کا اظہار مولوی

عبدالحق نے اس طرح کیا ہے کہ ''ایک روز مولوی عزیز مرزا مولوی ظفرعلی خان (سیدعلی) مرحوم کے یہاں مدعو تھے بارہ بجے کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی اساتذہ کے اشعار سناتے رہے جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے''۱۶؎

حیدرآباد کے اسی زمانے میں ظفرعلی خان نے **دکن ریویو** جاری کیا جس میں انھیں مولانا شبلی کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ **دکن ریویو** کے متعدد شماروں میں مولانا کی تخلیقات کی اشاعت ظفرعلی خان کے ساتھ ان کے تعاون اور خوردنوازی کا پتا دیتی ہے۔ہم نے **دکن ریویو** کے متعدد شماروں میں مولانا شبلی کا کلام دیکھا ہے یہی نہیں **دکن ریویو** میں ان کے مقالات بھی شائع ہوتے رہے ۱۷؎ ۔ظفرعلی خان نے اس قلمی تعاون کا اعتراف کرتے ہوئے **دکن ریویو** کے ایک اداریے میں لکھا:

''سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق ہمارے قلمی معاونین ہیں جن کے بغیر **دکن ریویو**، **دکن ریویو** نہ ہو۔یورپ اور امریکہ میں مضمون نگار بے معاوضہ لیے کچھ نہیں لکھتے۔ہمارے ملک میں ایسے لوگ جو مضمون لکھ سکتے ہیں اور وہ بھی ایسا کہ **دکن ریویو** میں اندراج کے قابل ہو اول تو ہیں ہی گنتی کے اور دوسرے انھیں صلہ کی پروا نہیں۔شکر ہے کہ جن اصحاب نے ہمارے لیے مضمون لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی وہ اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ہم اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہیں اور ان کی توجہات کے شکرگزار۔اصحاب ذیل کی عنایات کا سلسلہ اگر اسی طرح قایم رہا تو ترقی کا کوئی درجہ نہیں جو **دکن ریویو** طے نہ کرسکے''

ان اصحاب میں شبلی کا نام ''علامہء شبلی نعمانی اعظم گڑھ'' شمار چار پر شامل ہے۔۱۸؎ دکن سے پنجاب آجانے کے بعد جب ظفرعلی خان نے **دکن ریویو** کو **پنجاب ریویو** کا نام دے کر ازسرنو جاری کیا تو اس وقت بھی مولانا شبلی کا تعاون جاری رہا اور وہ **پنجاب ریویو** میں بھی لکھتے رہے۔

ادھر استادِ گرامی کے لیے ظفرعلی خان کے دل میں عقیدت کے جذبات موج زن تھے۔۱۹۰۶ء میں مولانا شبلی کی کتاب **موازنہ انیس ودبیر** منظرعام پر آئی تو بعض اطراف سے اس پر ناروا تنقید کا سلسلہ شروع ہوگیا ایک صاحب نے **المیزان** کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ایک اور صاحب نے جو خود کو ''شمس الشموس اوج سخنوری قمرالاقمار بروج نکتہ وری'' کہتے تھے ۲۷صفحات کے ایک رسالے کی شکل میں ردالموازنہ کے عنوان سے مولانا کی کتاب کا ردّ لکھا۔یہ جواب خوش ذوقی کا مظہر نہیں تھا ظفرعلی خان نے اس جواب پر گرفت کرتے ہوئے **دکن ریویو** کے اگست ۱۹۰۸ء کے ایڈیٹوریل میں اس کا جواب الجواب لکھا کہ:

''یہ کتاب مجموعہ ہے ان بازاری گالیوں، سوقیانہ پھبتیوں کا جو لکھنو کے نوابی دور نے اس برگشتہ بخت شہر کے اراذل وانفار کے ترکے میں چھوڑے ہیں اور نتیجہ ہے ایک ایسے شخص کے قلم کا جو مخالف سے معقولیت کے ساتھ عہدہ برآ نہ ہوکر گالیوں پر اتر آتا ہے اور اس پر دو چار فحش آوازے کس کر اپنے ہم مشربوں اور ہم چشموں میں اپنا اعتبار قائم کرکھنا چاہتا ہے''۱۹؎

صاحب **ردالموازنہ** نے شبلی پر تنقید کرتے ہوئے ان کے نام کو بھی نشانہ تضحیک بنایا تھا تبصرہ نگار اس پر تبصرہ کرتے ہوئے **ردالموازنہ** کے مصنف پر اسی کے انداز میں تنقید کرنے لگتا ہے:

> ''اگر کسی کے نام کی تضحیک سے اور وہ بھی اس پیرائے میں جو لکھنو کے ادانی و اقاصی ہی کا حصہ ہوسکتا ہے صاحب **ردالموازنہ** سمجھتے ہیں کہ انھوں نے موازنہ کی تردید کا حق ادا کردیا تو **ردالموازنہ** پر رائے زنی کرتے وقت ہمیں بھی پوراحق حاصل ہے کہ جس طرح انھوں نے نعمان کا وزن ثعبان بتایا ہے ہم بھی بلحاظ اس نسبت وعقیدت کے جو انھیں مرزا دبیر سے ہے دُبیری بروزن نُصیری کا گرما گرم فقرہ ان پر چست کرکے سمجھ لیں کہ ہم تنقید کے حق سے عہدہ برآ ہوگئے لیکن ثقاہت مانع آتی ہے کہ ہم اس قسم کے عامیانہ استدلال سے کام لیں'' ۲۰

آخر میں البتہ تبصرہ نگار معترض کو ایک اچھا مشورہ دیتا ہے

> ''بہتر ہو اگر افضل علی صاحب بجائے **ردالموازنہ** لکھنے کے جس کی قیمت اس سیاہی کے داموں کے برابر بھی نہیں جو اس کے سیاہ کرنے میں صرف ہوئی دبیر کے کلام کا ایک صحیح ایڈیشن شائع کرنے کی کوشش کرتے'' ۲۱

درمیان کے تند وتیز جملوں کو چھوڑ کر اختتام کلام پر تبصرہ نگار نے معترض کو ایک نہایت معقول تجویز پیش کردی ہے اور وہ یہ ہے کہ بجائے ان اشعار کے انتساب کا انکار کرنے کے جو محل اعتراض ہیں اپنے ممدوح کے کلام کے متن کو صحت کے ساتھ مرتب کیا جائے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ مشورہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور صرف مرزا دبیر ہی کے باب میں نہیں بلکہ تمام کلاسیکی شعرا کے حوالے سے ایک اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیام حیدرآباد کا یہ زمانہ مولانا شبلی نعمانی اور ظفر علی خان دونو ہی کے لیے خوش گوار تجربہ تھا اور دونو ہی حاسدوں کی نگاہوں کا شکار ہوئے۔ظفر علی خان کی **ستارہ صبح** میں شائع ہونے والی ایک تحریر سے جس کا حوالہ اوپر دیا جاچکا ہے ،حیدرآبادی صحبتوں کا خوش گوار نقشہ ابھرتا ہے اس نقشے میں مولانا حالی کی آمد اور داغ دہلوی کی وہاں موجودگی کو بھی شامل کر کے دیکھیں تو اس کا رنگ روغن اور زیادہ روشن ہوجاتا ہے۔مولانا حالی کی حیدرآباد آمد کے حوالے سے مولوی عبدالحق نے ایک دل چسپ واقعہ لکھا ہے جس سے مولانا حالی کی دل سوزی و اخلاص اور ظفر علی خان کی مشرقی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ظفر علی خان شاگرد تو شبلی کے تھے لیکن وہ اپنے دوسرے بزرگوں کے سامنے بھی شاگردوں ہی کی طرح مودب اور سر جھکائے دکھائی دیتے ہیں۔ظفر علی خان کے اخلاق وآداب کی جو تصویر مولوی عبدالحق کی تحریر سے ابھرتی ہے ویسی ہی تصویر ان خطوط سے بھی نمایاں ہوتی ہے جو انھوں نے اکبرالہ آبادی کے نام لکھے تھے ۲۲ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''ایک بار مولانا ظفر علی خان نے اپنے رسالہ **دکن ریویو** میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کتاب یا رسالے پر شائع کیے ،جن میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا جن دنوں مولانا حالی حیدرآباد آئے تھے مولانا ظفر علی خان سے ان کی ملاقات ہوئی اور دوران گفتگو میں

انھوں نے متذکرہ مضامین کے متعلق ظفر علی خان صاحب کو ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنا شروع کی کہ ان سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے مولانا نے یہ بھی فرمایا میں تنقید سے منع نہیں کرتا تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہو گی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے یہاں میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مولانا شبلی کو مولانا حالی سے کوئی بغض نہ تھا وہ بھی ان کی علمیت سے قائل تھے جب مولانا کو شمس العلما کا خطاب ملا تو مولانا شبلی نے مجھ سے فرمایا اب اس خطاب کی عزت بڑھ گئی !!'' ۲۳

اس اقتباس میں شبلی کی کسی کتاب پر تبصرے میں بے جا شوخی کا جو ذکر ہے وہ ظفرعلی خان کی مذکورہ بالا سعادت مندی سے میل کھاتا دکھائی نہیں دیتا۔ ہوسکتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کی یادداشت میں **موازنہ انیس ودبیر** کی حمایت میں لکھا جانے والا وہی مضمون ہو جس کے کچھ اقتباسات قارئین سطور بالا میں ملاحظہ فرما چکے ہیں جو **موازنہ انیس ودبیر** کی حمایت میں لکھا گیا۔ شوخی ومخالفت کا مظاہرہ اگر ہوا ہے تو وہ **ردالموازنہ** کے مصنف کی نسبت سے ہے نہ کہ شبلی نعمانی کے لیے، جن کی تائید وحمایت کے لیے مضمون لکھا گیا ہے۔ مولانا حالی کی جو گفتگو مولوی صاحب نے نقل کی ہے وہ عین ان کی شخصیت کے مطابق ہے جن کا معیار اخلاق مخالف کے لیے بھی وہی ہے جو ممدوح کے لیے ہے اور اس میں شبہ نہیں محولہ بالا تبصرے میں ظفرعلی خان کے قلم کی شوخی اس معیار سے دور جا پڑی ہے۔

ظفرعلی خان عمر بھر اپنے استاد کے مداح اور معترف دکھائی دیتے ہیں جہاں ممکن ہو وہ اپنے استاد کی تجلیل کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے وہ بزم اردو میں فلسفہ رسالت پر تقریر کرتے ہوئے معجزات اور دلائل نبوت کی بحث میں شبلی کی کتاب **الکلام** کو بے مثال قرار دیتے ہیں، ۲۴ آل انڈیا ریڈیو سے اقبال پر تقریر کرتے ہوئے اپنے استاد کا نظریہ شعر بیان کرتے ہیں ۲۵ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ استادِ گرامی کی پسندیدہ کتاب، **الفاروق** کے انگریزی ترجمے کی طرف متوجہ ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی کتابوں میں شبلی کو **الفاروق** سب سے زیادہ پسند تھی وہ اسے اپنی ''مرصع غزل'' کہتے تھے ۲۶ **سیرۃ النبی** ؐ کو چھوڑ کر شبلی نے جس کتاب کے لیے سب سے زیادہ محنت کی وہ یہی **الفاروق** تھی ۱۹۰۰ء میں ظفرعلی خان نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔ کہا گیا ہے کہ یہ ترجمہ شمس العلما سید علی بلگرامی (۱۸۵۱ء......۱۸۷۴ء) کی فرمائش پر کیا گیا ۲۷ یہ بھی ممکن ہے کہ خود شبلی نے اپنے شاگرد سے اس ترجمے کی فرمائش کی ہو کیونکہ وہ اپنے پیغام کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچانا چاہتے تھے اور اپنے شاگرد کی صلاحیتوں سے بھی واقف تھے۔ افسوس کہ یہ ترجمہ مولانا شبلی کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا اور ان کی وفات کے بھی ایک طویل عرصے کے بعد ۱۹۳۹ء میں لاہور سے چھپ سکا اور ماضی قریب میں اس کی ایک نئی اشاعت بھی اسی ادارے سے سامنے آئی ہے جس نے اسے پہلی بار شائع کیا تھا ۲۸ اس ترجمے کے دیباچے میں ظفرعلی خان اپنے استاد کا تعارف اس طرح کرواتے ہیں:

Prof Shibli (Shams-ul-Ulama) was a distinguished member of that enlightened group of Indian Muslims whose leader was the late Sir Syed Ahmad Khan, the founder of the Muhammadan Anglo Oriental College at Ali garh He is a profound scholar of Arabic and is thoroughly conversant with the annals of early Islam.[۲۹]

ادھر مولانا شبلی نے بھی اپنے عزیز شاگرد کی حوصلہ افزائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا حیدرآباد لانے سے لے کر ان کی حیدرآبادی ادبی زندگی تک میں ہمیں شبلی کی حوصلہ افزائی کارفرما دکھائی دیتی ہے ۔وہ دریا گنج کی قیامت صغریٰ پر ظفر علی خان کی طویل نظم **شور محشر** پر انھیں داد دیتے ہیں[۳۰] **دکن ریویو** میں قلمی تعاون کرتے ہیں اور جب **معرکہ مذہب وسائنس** شائع ہوتی ہے تو اسے ایسا ترجمہ قرار دیتے ہیں'' جو مایوسی کی تاریکی میں امید کی جھلک پیدا کر دیتا ہے'' شبلی رسالہ **الندوہ** میں اس پر مفصل ریویو کرتے ہوئے اپنے شاگرد کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :''مترجم صاحب مشہور مترجم ہیں ، ان کی کتاب **خیابان فارس** متداول ہو چکی ہے۔ **دکن ریویو** نے بھی ان کو کچھ کم روشناس نہیں کیا ہے۔ترجمہ کی خوبی پر میں کچھ رائے نہیں دے سکتا، کیونکہ میں انگریزی نہیں جانتا ، اس لیے ترجمہ کی صحت اور غلطی کا فیصلہ نہیں کر سکتا ، البتہ اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ کسی علمی کتاب کا صحیح ترجمہ اس سے زیادہ صاف اور قریب الفہم نہیں ہوسکتا۔مترجم نے مصطلحاتِ علمی کے ترجمہ میں بہت سے الفاظ گویا خود پیدا کیے ہیں ۔ چنانچہ خاتمہ میں ایسے الفاظ کی فہرست دی ہے،اس میں بہت سے الفاظ ہم کو جدید النشاۃ نظر آتے ہیں مثلاً اسد کہفی ، نباتات خوار، دور ثالثۃ الوسطی، دولاب تعدیل ،توشیم ، جماعت اکثرین، تقدیس الاموات وغیرہ وغیرہ۔''[۳۱]

ظفر علی خان نے ترجمے میں اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جہاں کہیں انھیں مصنف کی آرا، خلافِ انصاف نظر آئیں یا مصنف کی معلومات کے نقص سے انھیں قاری کی گمرہی کا اندیشہ ہوا انھوں نے حواشی میں اس کی تصحیح یا تصریح کر دی ان حواشی کے بارے میں شبلی نے لکھا:''مترجم کا یہ خاص احسان ہے کہ مصنف نے جہاں کوئی بات اسلام کے خلاف لکھی ہے انھوں نے نوٹ میں اچھی طرح اس کی پردہ دری کی ہے۔اس وقت وہ مترجم نہیں بلکہ اچھے خاصے تند مزاج مولوی ہیں''[۳۲] مترجم کے لیے یہ فخر ہی کیا کم تھا کہ جس سال استاد کی کتاب کو پنجاب یونی ورسٹی نے بہترین تصنیف کا انعام دیا اسی سال **معرکہ مذہب و سائنس** کو بہترین ترجمہ ہونے کا انعام ملا[۳۳] اس پر استاد کی جانب سے ایسی تعریف وتوصیف بھی ملی۔ یہ حوصلہ افزائی اس کا دل بڑھانے کے لیے کافی تھی۔

سررشتہ علوم وفنون ریاست حیدرآباد دکن سے شبلی کی وابستگی مئی ۱۹۰۱ء سے جنوری ۱۹۰۵ء تک مجموعی طور پر تقریباً چار سال رہی اس کے بعد شبلی لکھنو آ کر ندوۃ العلما سے وابستہ ہو گئے۔ یہ اوائل ۱۹۰۵ء کی بات ہے۔ ندوے سے ان کی وابستگی جولائی ۱۹۱۳ء تک تقریباً آٹھ سال رہی اس دوران میں بھی لائق شاگرد سے ان کا رابطہ برقرار

رہا جس کا ثبوت ۱۹۱۲ء میں لکھے ہوئے اس خط سے ملتا ہے جس میں وہ انھیں ''عزیزی مولوی ظفر علی خان'' کہہ کر مخاب کرتے ہیں اور ترکوں کے بارے میں اپنے فتوے کی تفصیل اور جواز سے آگاہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔شبلی کے نزدیک ترکوں کی حمایت و امداداس وقت فرض عین ہوچکی ہے اور عیدقربان کی قربانی پر، جو واجبات میں سے ہے،ترکوں کی امداد کا فرض عین فائق ہے ۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ ظفر علی خان نے انھیں کوئی خط لکھا ہے یا شبلی تک ان کی کوئی تحریر پہنچی ہے جس میں عیدقربان کی قربانی کو فائق قرار دیتے ہوئے اس سنت ابراہیمی کی ظاہری صورت پر اصرار کیا گیا ہے شبلی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو یاں وہی سنت مقصود ہے فرق یہ ہے کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیل پر مقصود تھی''اپنے اس موقف کو واضح کرنے کے بعد وہ مخاطب سے یہ سوال کرتے ہیں کہ ''کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے''اس سے شبلی کی ترکوں کے ساتھ غایت درجہ وابستگی اور محبت کا اظہار ہوتا ہے ترکوں اور خلافت کے ادارے سے جذباتی وابستگی میں ظفر علی خان بھی کسی سے کم نہ تھے انھوں نے خود ہندوستان سے ترکوں کے لیے چندہ جمع کیا اور یہ تحفہ خود ترکی جا کر سلطان کی خدمت میں پیش کیا جس سے ان کے جذبے کی شدت اور حرارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی ترکوں کی محبت میں ظفر علی خان سے بھی آگے ہیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ شاگرد کے دل میں بھی ترکوں سے محبت کی جوت استاد ہی نے جگائی ہو......؟شبلی کی ترکوں سے محبت کا اظہار صرف اس خط ہی سے نہیں ہورہا بلکہ ان کی شاعری میں بھی یہ محبت چھلکتی دکھائی دیتی ہے جیسا کہ انھوں نے اس خط میں بھی اپنی ایک نظم اقتباس کی ہے۔اب لائق شاگرد کے نام استاد گرامی کا مکتوب ملاحظہ ہو:

عزیزی مولوی ظفر علی خان صاحب دام قدرہ السلام علیکم

میں نے جو فتویٰ لکھا اس سے علمائے فرنگی محل بھی متفق ہیں اور مولوی عبدالباری صاحب کا خط بھی شائع ہو چکا ہے **ھدایہ** میں اس کا جزئیہ موجود ہے البتہ **ھدایہ** میں صرف جواز ہے اور میں نے افضلیت کا فتویٰ دیا ہے اس قدر میرا اجتہاد ہے ۔

بھائی !ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو پاں وہی سنت مقصود ہے فرق یہ ہے کہ آپ اس سنت کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیل پر مقصود تھی کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے یہاں کے جلسے میں میں نے چند شعر پڑھے تھے مناسبت موقع سے چند شعر[کذا] درج ہیں:

مراکش جا چکا ، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک
حریفوں کو گلہ ہے آسماں سے خشک سالی کا ہم اپنے خون سے سینچیں گے ان کی کھیتیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں کہ اب امن و امانِ شام ونجد وقیرواں کب تک

شبلی لکھنو ۱۶ر نومبر ۱۹۱۲ء ۳۴؎

یہ مکتوب ۱۹۱۲ء میں لکھا گیا۔ استادِ گرامی نے اپنے جو اشعار اس خط میں درج کیے وہ شہر آشوب اسلام کے تحت ''ہنگامہ طرابلس وبلقان'' کے زیرِعنوان ان کی کلیات میں شامل ہیں۔مولانا شبلی نے یہ نظم رفاہ عام لکھنو کے جلسے میں پڑھی تھی ،سید سلیمان ندوی کے بہ قول جب یہ نظم ''پڑھی گئی تو اس کا یہ اثر تھا کہ صدر سے لے کر پائین تک ماتم برپا ہوگیا تھا'' ۳۵؎ ان اشعار نے ظفرعلی خان کو بھی متاثر کیا، اس کے آٹھ برس بعد خلافت کانفرنس برہان پور میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے انھیں اپنے استاد کی یہی نظم یاد آتی ہے اور وہ اس نظم کے اشعار سے اپنے خطاب کومزین کرتے ہیں ۳۶؎ اسی پر بس نہیں استاد کے اس رنگ و آہنگ نے شاگرد کو اس قدر متاثر کیا کہ تین دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی یہ آہنگ ان کے درِدل پر دستک دیتا ہے اور وہ یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو بہ تبدیل قافیہ کہتے ہیں:

گجردم ملت بیضا سے پوچھا آج ہاتف نے — کہ چھوڑیں گے خداوندانِ مغرب اپنی خوکب تک
ملوکیت کے پیراہن کی رنگینی کو مشرق میں — رہے گی میرے خونِ ناروا کی جستجو کب تک
شرابِ خانہ ساز آئے گی کب بطحا کی بھٹی سے — رہیں گے فارغ اس کے دور سے جام وسبو کب تک
قبائے سلطنت قامت پہ کس دن راس آئے گی — کرے گا اسکو پاکستان کا درزی رفو کب تک ۳۷؎

شبلی کی شاعری سے ظفرعلی خان کے شغف کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ وہ ان کے کلام کو انگریزی زبان میں منتقل کرتے ہیں۔ **الفاروق** کا انگریزی ترجمہ ان کی شبلی کی نثر اور تحقیق سے اثر پذیری کا مظہر ہے تو مسجد کان پور کے سانحے پر شبلی کی نظم کا مندرجہ ذیل ترجمہ ان کی شاعری سے اثر پذیری کا:

I saw some lifeless bodies yesterday,
All pierced through with gaping wounds were they.
And some were children silent as the tomb,
Their tender years reproached their tragic doom.
"We came to build the House of God on high,
But feeling drowsy slept, they seemed to sigh"
"And now we wait till Israfil shall sound,
His clarion which will bring senses round"
And some were young, even in the prime of life,
Versed in world's ways, skilled in stress and strife.
Their singing youth in tones of burning pride,
Confessed the guilt which weakness strove to chide.
Their haughty valour made their brawny breast,
A living shield for lance set in rest.

Their eager souls forestalled their ghostly fate,
Their right hands cut their throats, they scorned to wait.
And some were old men here not with rage and toil,
Who moved to shuffle off this mortal coil.
And as they rolled in dust and blood it seemed,
A halo round their beaming bodies gleamed.
I said "who are you" and could say no more,
A voice replied, "The victims of cawnpore" ۳۸

باہمی تعلق کے کچھ اور مظاہر بھی ایسے ہیں جن سے ظفر علی خان اور مولانا شبلی کے ربط و تعلق کی وسعتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً وہ مئی ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد آئے تھے یہاں کا قیام خاصا خوش گوار رہا تھا لیکن جیسا کہ ریاستوں اور خودمختار اداروں میں ہوتا ہے حالات بدلتے دیر نہیں لگتی ۱۹۰۴ء میں صورت حال نے پلٹا کھایا وہ لوگ جو آغاز ہی سے سررشتۂ علوم وفنون کو ''فضول سمجھتے'' تھے غالب آ گئے ۳۹ اور یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ مولانا شبلی جس شعبے میں کام کررہے ہیں اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ چنانچہ اس کی تحقیق کے لیے ایک کمیشن بٹھا دیا گیا جس نے رپورٹ دی کہ اس صیغے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اگرچہ ریاست کے مدارالمہام مولانا کے وہیں رہنے کے حق میں تھے لیکن مولانا بددل ہو چکے تھے اب ان کے سامنے دوراستے تھے وہ واپس علی گڑھ چلے جائیں یا ندوۃ العلما جائیں شبلی کو دونوا داروں سے تعلقِ خاطر تھا۔ ندوہ جانا سراسر قربانی اور ایثار کا تقاضا کرتا تھا، انھی دنوں انھوں نے لکھنو سے نکلنے والے اخبار **ہندوستانی** میں جس کے مدیر گنگا پرشاد ورما تھے، ایک ہندوانجمن کی تاسیس اور ہندوؤں میں قومی ایثار کے جذبے کا پڑھا تو ان کی اثر پذیر طبیعت بہت متاثر ہوئی اور انھوں نے ندوہ جانے کا فیصلہ کرلیا لیکن یوں کہ وہ علی گڑھ اور ندوہ دونو کو وقت دیتے رہیں گے ۴۰ مولوی بشیرالدین ایڈیٹر **البشیر** اٹاوہ کے نام ایک خط کا دیکھنا اس سلسلے میں صورت حال کی وضاحت کرتا ہے جس میں ظفر علی خان کا بھی ذکر ہے:

> مکرمی! اصل یہ ہے کہ میں اخبار **ہندوستانی** میں اکثر ہندوؤں کے ایثارِ نفس کے واقعات پڑھا کرتا تھا اور ہر دفعہ مجھ کو نیا جوش پیدا ہوتا تھا یہاں تک کہ ایک دفعہ **ہندوستانی** کا پرچہ دیکھ کر اس قدر اثر ہوا کہ اسی وقت میں نے ظفر علی خان کو بھیجا کہ عماد جنگ سے کہو کہ میرا منصب جو رک گیا تھا، جاری کرا دیں تو میں فوراً استعفیٰ دے کر چلا جاؤں لیکن عماد جنگ کچھ نہ کر سکے بالآخر میں نے دلیری کرکے استعفیٰ دے دیا اور چلا آیا منصب پھر جاری ہوگیا ارادہ بھی یہی تھا اور ہے کہ علی گڑھ اور لکھنو دونو جگہ بہ حصہ مساوی قیام کروں لیکن لکھنو آ کر دیکھا تو موجودہ ناظم کی کج روی نے ندوہ کو جاں بلب کر دیا ہے دیکھا نہ گیا۔ کوشش کرکے ان کو نظارت سے ہٹایا اور دارالعلوم کو ہاتھ میں لیا۔ چونکہ تمام امور درہم برہم ہیں دو تین مہینے مستقل قیام کرنا پڑے گا تا کہ انتظام کے پرزے کام دینے لگیں۔ امید ہے کہ جب ایک ڈھچر قائم ہوجائے تو علی گڑھ

جانے اور رہنے کا موقع ملے یہاں کے طلبا میں جو روشن خیالی اور قابلیت علمی ہے بخدا مدارس عربیہ میں اس کا پرتو تک نہیں۔ کسی قومی کام پر اپنے آپ کو وقف کرنا بڑا کام ہے۔ میرا منہ نہیں کہ میں یہ دعویٰ کروں، اس لیے میں نے اپنے منہ سے یہ حرف نہیں نکالا البتہ طریق عمل سے لوگوں نے قیاس کیا اور شہرت دی۔ ہاں انجمن کا کام جاری رہے بابو صاحب کو کہیے کہ کتابیں بھیج دیں۔ ندوہ کی ہمدردی پر بعض حامیان کالج مجھ کو رقیبانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن میں اس کو کیا کروں میرے نزدیک ندہ کے مقاصد کالج کو قوت دینے والے ہیں۔'' ۴۱

بعض اشاروں سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ندوے جانا شبلی کی دیرینہ خواہش بھی تھی ریاست کے مذکورہ حاالات نے اس خواہش کے لیے راہ ہموار کر دی مثلاً ۱۸/ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں سال بھر سے اس کوشش میں مصروف تھا کہ وظیفہ (حیدرآباد) جاری ہوجائے تو سال بھر کی رخصت لے کر ندوہ میں آؤں اور پھر ترک ملازمت کردوں لیکن دو ہفتے ہوئے نتیجہ اخیر ناکامی ہوئی اب جو کچھ ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ چھ مہینے کی رخصت لوں اور ندوہ میں آؤں۔ رخصت میں تنخواہ نہ ملے گی شاید ابتدائی مہینوں کی ملے اس وقت رخصت لینا اس لیے بیکار ہے کہ مہینہ بھر کے بعد رمضان کی تعطیل ہوجائے گی اس کے سوا ندوے اور کانفرنس کے لیے پھر ادھر آنا پڑے گا............'' شبلی ۱۸/ اکتوبر ۱۹۰۳ء ۴۲

آخر حیدرآباد چھوڑتے ہی بنی اور وہ اوائل ۱۹۰۵ء میں سررشتہ علوم وفنون سے مستعفی ہوکر لکھنو چلے گئے۔ ہر چند نواب محسن الملک نے علی گڑھ اور بیگم صاحبہ بھوپال نے بھوپال آنے کی دعوت دی لیکن شبلی نے کہیں اور جانا پسند نہ کیا ۴۳

﴿۲﴾

نشیب وفراز انسانی تعلقات کا خاصہ ہیں، کوئی بھی رابطہ ہو سدا ایک ہی رنگ پر قائم نہیں رہتا۔ مزاجوں کا اختلاف اس میں نشیب وفراز کی کیفیت پیدا کر ہی دیتا ہے شبلی اور ظفر علی خان کے باہمی ربط ضبط میں بھی بعض اوقات دراڑ پیدا ہوئی اس کا سبب ظفر علی خان کی متلون مزاجی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ ظفر علی خان کی طبیعت میں منصوبہ سازی کا عنصر بہت تھا۔ وہ منصوبے بہت تیزی سے بناتے اور جلد فراموش بھی کر دیتے۔ شبلی کے خطوط میں ظفر علی خان کے تلوّن کا شکوہ ہے۔ ۳۰/ مارچ ۱۹۰۸ء کو مولوی سید ممتاز علی کے نام لکھے جانے والے خط میں وہ کسی ایسے منصوبے کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں ظفر علی خان کے سپرد ایک کتاب کا ترجمہ کیا گیا تھا اور اس کے لیے جو مدت مقرر کی گئی تھی وہ گزر جانے کے باوجود یہ ترجمہ تیار نہیں ہوسکا۔ یہ ترجمہ چونکہ شبلی کی تجویز پر کیا جانا تھا اور یہ بات متعلقہ انجمن کی رپورٹ میں بھی آ چکی تھی اس لیے شبلی نے اس منصوبے کی ناکامی پر پریشان ہوکر لکھا:

'' مسٹر ظفر کی وجہ سے بڑا دھوکا ہوا انھوں نے کتاب کے اسی قدر اجزا ترجمہ کیے تھے کہ اور کاموں میں مصروف ہوگئے وہ نہایت متلوّن الطبع آدمی ہیں مجھ کو سخت افسوس ہے کہ رپورٹ

میں اس کا تذکرہ ہو چکا ہے لوگ مجھ کو کیا کہیں گے؟ انھوں نے اپنا ذاتی مطبع بھی قائم
کرلیا ہے ایک دن کہتے تھے کہ میں اپنے ہی مطبع میں چھپواؤں گا لیکن یہ بھی ایک بات ہے
کتاب تیار ہی نہیں اور نہ ایک مدت تک امید ہے'' ....شبلی ۳۰/مارچ ۱۹۰۸ء ۴۴؎

یہاں صورت حال خاصی سنجیدہ ہوگئی ہے۔ منصوبے کو قبول کرلینا اور بروقت مکمل نہ کرنا پریشان کن ہوسکتا ہے اورمولانا شبلی کو کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آئی ہے۔ ظفر علی خاں کی سیرت چند جملوں میں بیان کرنا ہو تو بہ قول چراغ حسن حسرت یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''وہ ہاتھ کے سخی، دل کے نرم، کان کے کچے اور دھن کے پکے تھے، ان کی آرزو تھی کہ دنیا کے سارے کام ان کے ہاتھوں انجام پاجائیں لیکن ایک سر ہزار سودا بچارے کیا کیا کرتے۔

غمِ عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم
چسان در شیشہء ساعت کنم ریگِ بیابان را ۴۵؎

پھر حالات ناموافق، سروسامان ناپید، وقت ساتھ نہیں دیتا اور رفقا، ہمرہانِ سست عناصر دو قدم ساتھ نہیں چل سکتے، مسئلہ فلسطین کی گتھی کون سلجھائے ......؟ مسلمانوں کی تجارت کا انتظام کون کرے......؟ مسجدوں کی تنظیم کے لیے کہاں سے کارکن آئیں......؟ مسلم لیگ کی شاخیں کون کھولے......؟ تحریکِ اتحادِ ملت تو چل رہی ہے لیکن اس تحریک کو سارے ہندوستان میں پھیلانا ہے، تبلیغ کا کام بھی تھوڑا بہت ہوتے رہنا چاہیے اور ان جھگڑوں میں اُردو کی خدمت تو رہ گئی اُردو میں کام کی کتابیں انگلیوں پر گننے کے لائق ہیں، یورپی زبانوں کی ساری قابلِ ذکر کتابوں کا ترجمہ اُردو میں ہوجانا چاہیے'' ۴۶؎ ...... یہ تھا مولانا ظفر علی خان کا مزاج اور احوال جس میں استادِ گرامی کو شکوہ پیدا ہوا کہ انھوں نے منصوبے کے مطابق ترجمہ مکمل کر کے نہیں دیا اور استاد کو خفت اٹھانی پڑی۔

بہ ظاہر اس کتاب کا سراغ لگانا، جس کے ترجمے کا یہ ذکر ہے، دشوار ہے۔ جستجو کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا تھا، اس کے صدر پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ اور سیکریٹری مولانا شبلی نعمانی مقرر ہوئے تھے۔ مولانا شبلی کو اردو کا دامن وسیع کرنے کے لیے تراجم کا بہت خیال رہتا تھا ان کے خطوط سے اس دل چسپی کا حال معلوم ہوتا ہے وہ ہر صاحبِ علم سے ترجمے کی خواہش کرتے تھے اس طرح انھوں نے بہت سے اصحاب سے ترجمے کروا کر اردو کا دامن وسیع کیا۔ انجمن ترقی اردو میں بھی ترقیِ اردو کے لیے ان کا پہلا ہدف غیر زبانوں کی علمی کتابوں کے اردو میں تراجم تھا چنانچہ انھوں نے اس انجمن کے سیکریٹری کی حیثیت سے چودہ کتابوں کے تراجم کا پروگرام بنایا جن میں دوسرے نمبر پر Conflict Between Religion and Science کا نام ملتا ہے ان تراجم کی جانچ کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس میں پروفیسر آرنلڈ، علامہ اقبال اور ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل تھے ۴۷؎

ظفر علی خان کے اس زمانے کے دیگر تراجم پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ **سیر ظلمات** ۱۹۰۰ء میں **جنگل میں منگل** ۱۹۰۱ء میں **خیابان فارس** ۱۹۰۲ء میں چھپ چکی تھیں، **جنگ روس و جاپان**، بھی پہلی بار ۱۹۰۵ء میں چھپ چکی تھی۔ ۴۸؎ ظفر علی خان کے کیے ہوئے تراجم میں شبلی کی نشان زدہ کتاب کا ترجمہ بھی شامل

ہے جو **معرکہ مذہب وسائنس** کے نام سے شائع ہوا اور جس پر، جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہوا، مولانا شبلی نے ایک مفصل تبصرہ لکھا جو رسالہ **الندوہ** میں شائع ہوا۔ لیکن الجھن یہ ہے کہ **معرکہ مذہب و سائنس** کے انتساب میں ظفرعلی خان نے لکھا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ نواب محسن الملک کی تحریک پر پندرہ سال پہلے کیا تھا جو اب نظر ثانی کے بعد حواشی کے ساتھ مکمل ہو کر شائع ہو رہا ہے۔ یہ انتساب ۱۹۱۰ء کا ہے اس کا مطلب ہے ترجمہ ۱۸۹۵ء میں کیا گیا تھا ......؟ پھر ۱۹۰۸ء میں شبلی ترجمے کی ناتمامی کا شکوہ کیوں کر رہے ہیں؟ اس الجھن کو سلجھانے کی ایک ہی صورت ہے کہ یہ مانا جائے کہ ظفرعلی خان نے ترجمے کا آغاز ۱۸۹۵ء میں کر دیا ہوگا البتہ اس کی تکمیل ۱۹۱۰ء میں جا کر ہوئی جیسا کہ انتساب کی عبارت میں نظر ثانی اور حواشی کے کام کا بعد میں انجام پانا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے اس قیاس کی تصدیق مصنف کے حالات کے آخر میں درج مترجم کے نام کے نیچے دی ہوئی تاریخ سے بھی ہو رہی ہے جو ''کرم آباد ۵/مارچ ۱۹۱۰ء'' ہے ......واللہ اعلم بالصواب......اس کا مطلب ہے کہ شبلی کی فرمائش پر ظفرعلی خان نے اپنے پہلے سے جاری منصوبے کو ان کے اشاعتی پروگرام سے منسلک کر دیا لیکن اندازے کے مطابق یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ شبلی کا شکایتی خط ۳۰/مارچ ۱۹۰۸ء کا ہے **معرکہ مذہب وسائنس** ۱۹۱۰ء میں انجمن اردو حیدرآباد دکن نے رفاہ عام سٹیم پریس لاہور سے شائع کی۔ اس کا مطلب ہے دو برس بعد ہی سہی ظفرعلی خان نے اپنا کام بالآخر پورا کر دیا تھا۔ جہاں تک ظفرعلی خان کے اس بیان کا تعلق ہے کہ انھوں نے اپنا مطبع بھی قائم کر لیا ہے اور وہ یہ کہتے تھے کہ میں کتاب اپنے ہی مطبع میں چھپوا دوں کا تو اس کا امکان ہے کہ وہ حیدرآباد کی خوش حالی کے زمانے میں اپنا مطبع قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوں جیسا کہ **دکن ریویو** کے طابع کے طور پر چھپنے والے 'مطبع اختر دکن حیدرآباد دکن' کے الفاظ اس کی تائید کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان کے فرزند کا نام اختر علی خان تھا۔ اگر ظفرعلی خان کے ناتمام منصوبوں کی جستجو کی جائے تو البتہ سکاٹ کی **تاریخ اندلس** کا سراغ ملتا ہے جس کے بارے میں چراغ حسن حسرت نے لکھا ہے کہ '' سکاٹ کی **تاریخ اندلس** کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا، جو اُدھورا ہی رہ گیا''[۴۹]

ظفرعلی خان کے بارے میں شبلی کی رائے کے اس رخ کا سراغ ان کے ایک اور خط میں بھی ملتا ہے۔ یہ خط بمبئی سے ۲۰/اگست ۱۹۱۳ء کو مولانا حمیدالدین فراہی کے نام لکھا گیا۔ مولانا حمیدالدین فراہی شبلی کے عزیز اور شاگرد تھے بلکہ عزیز تر شاگرد تھے جن کے علم وفضل پر شبلی غیر معمولی اعتماد کرتے تھے، اس خط میں بھی ان کے ساتھ کچھ علمی مسائل زیر بحث ہیں ان کے ساتھ شبلی لائق شاگرد کو اپنی سرگرمیوں اور تازہ ترین مصروفیات سے بھی آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انصاری وفد جو قسطنطنیہ سے واپس آیا اس پر میں نے ایک نظم لکھی تھی شاید تم نے دیکھی ہو زمیندار و وکیل میں چھپی تھی، جلسہ میں تمام لوگ بے اختیار روتے تھے مجھ پر خود بھی رقت طاری تھی۔ ظفرعلی ملے تھے وہ تو بڑی امیدیں دلاتے ہیں لیکن وہ غیر معتدل جوش اور خوش اعتقادی ہیں ان کا اصرار ہے کہ تم اور حمید مدینہ یونی ورسٹی کے لیے چلے جاؤ ان کا خیال ہے کہ خود وہاں

سے طلبی ہوگی.....''۵۰؎

یہ وہ زمانہ ہے جب جنگ بلقان کے سبب سے سارا ہندوستان ترکوں کی محبت سے معمور تھا مسلمانان ہند کی جانب سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں ایک طبی وفد ترکی بھیجا گیا تھا جس نے ترک بھائیوں کو ہندی مسلمانوں کی محبت کا عملی پیغام پہنچایا تھا ادھر ظفر علی خان اور ان کے اخبار **زمیندار** نے مسلمانان ہند کو خبر رسانی کے جدید ترین ذرائع اختیار کر کے جنگ کی تازہ ترین صورت حال سے باخبر رکھا تھا اور خود بھی چندہ جمع کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کرنے ترکی گئے تھے اور انھی دنوں واپسی ہوئی تھی۔ شبلی جس جلسے میں نظم سنانے کا ذکر کر رہے ہیں وہ ڈاکٹر انصاری کے وفد کی واپسی پر ان کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا...... یہاں شبلی کی شخصیت اور ان کے قومی جذبات کا اندازہ لگانے کے لیے اس منظر کو دیکھنا چاہیے جس میں بوڑھے علامہ شبلی نعمانی، گاڑی کے دروازے پر کھڑے ترکی جاتے ہوئے جوان ڈاکٹر انصاری کے قدموں میں جھک کر ان کا بوسہ لیتے اور انھیں اپنے اشکوں سے دھوتے دکھائی دیتے ہیں ......واپسی پر جب ڈاکٹر انصاری نے مولانا کو اپنے قدموں کا بوسہ لینے سے روک دیا تو مولانا نے فرمایا کہ ''یہ تمھارے پاؤں نہیں اسلام کے مجسمہ غربت کے پاؤں ہیں'' ۵۱؎ مولانا شبلی کے یہی جذبات محبت وعقیدت تھے جو اس جلسے میں شعروں کی صورت ظاہر ہوئے جو انصاری وفد کی واپسی پر اس کے استقبال کے لیے بمبئی میں منعقد کیا گیا تھا نظم کے دو بند ہیں دوسرا بند بہ قول شخصے'' قیامت کا ہے، ناممکن ہے کہ آج بھی وہ پڑھا جائے اور سننے والے کا دل اثر سے نہ بھر جائے''۵۲؎ ......نظم کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے:

جنون جوش اسلامی کو ئی سمجھا تو تم سمجھے کہ تم نے لیلی اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں
دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبول یزدانی تو اب دستِ دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

نظم طویل ہے پوری نظم **کلیات شبلی** اور **حیات شبلی** میں دیکھی جاسکتی ہے۵۳؎ ۔

اب آتے ہیں شبلی کے مکتوب میں مذکور دوسری بات کی طرف: ظفر علی خان کی رجائیت اور ان کی امیدیں جنگ کے بعد ترکی خلافت کے احیا کی بھی ہو سکتی ہیں اور شبلی کے مستقبل کے حوالے سے بھی .... جنگ بلقان کے نتائج میں ایک یہ احساس بھی تھا کہ مدینہ منورہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں تمام عالم اسلام سے طالب علم جمع ہوں اور عالم اسلام کے قابل ترین دماغ ان کی تعلیم وتربیت کریں مولانا شبلی نے اس یونی ورسٹی کے نظام اور نصاب تعلیم کے سلسلے میں مفصل تجاویز لکھ کر شائع کی تھیں۵۴؎ اس تجویز کے حوالے سے ظفر علی خان نے شبلی سے جو کہا اس سے ان کے نیک جذبات اور تمناؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ شبلی اپنے ایک دوسرے خط میں اس رائے کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''افسوس ہے کہ اب ہمت نہیں کہ اس کے متعلق کچھ کر سکوں پہلی سی بات ہوتی تو مدینہ جانا کیا مشکل تھا''۵۵؎ بہ ہر حال اس مکتوب سے یہ واضح ہے کہ ظفر علی خان اپنے استاد گرامی مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کی قابلیت کے حوالے سے کیسی بلند رائے رکھتے تھے کہ ان کے خیال میں ان دونو اصحاب

کے علم وفضل کے اظہار کے لیے مدینہ یونی ورسٹی بہتر پلیٹ فارم ہوسکتا تھا، باقی رہا اس پر شبلی کا تبصرہ تو اس پر کسی حد تک پہلے بات ہوچکی ہے البتہ شبلی کے جملے میں جو جھول پایا جاتا ہے اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ مجموعہ مکاتیب کے جامع سے نقل میں کچھ تسامح ہوا ہے ورنہ ''وہ غیر معتدل جوش اور خوش اعتقادی ہیں'' کی جگہ ......غیر معتدل جوش اور خوش اعتقادی کے حامل ہیں ہونا چاہیے تھا۔

یہ شبلی کی زندگی کا آخری بھرپور سال ہے اس سے اگلے برس ۱۹۱۴ء میں وہ راہی ملک عدم ہوگئے ۔افسوس کہ اس زمانے کے **زمیندار** کے فائل محفوظ نہیں ورنہ اس زمانے کے اخبارات ان مباحث پر واضح روشنی ڈال سکتے تھے ......قدیم لائبریریوں میں **زمیندار** کا ریکارڈ موجود نہیں۔لاہور میوزیم کی لائبریری میں جو کٹے پھٹے شمارے ہیں ان میں ۱۹۲۰ء سے پہلے کا کوئی شمارہ نہیں ہے۔ **زمیندار** کے اداریوں کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس کا آغاز جنوری ۱۹۲۳ء سے ہوتا ہے ۵۶ اندریں حالات ہم دستیاب مآخذ ہی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں.......................

شبلی کے بارے میں ظفر علی خان کی ایک تحریر کا حوالہ تو سطور بالا میں دیا جاچکا ہے۔شبلی پر ظفر علی خان کے نام سے ایک اور تحریر ''آفتاب علم غروب ہوگیا'' **کریسنٹ** لاہور کے شبلی نمبر میں شائع ہوئی تھی جو دراصل شبلی کی وفات پر شائع ہونے والا تعزیتی اداریہ تھا۔حال ہی میں اس اداریے کی ۲۳ اور ۲۴ نومبر ۱۹۱۴ء کی دونو اقساط سامنے آئی ہیں جن کے ساتھ یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ یہ تحریر مولانا ظفر علی خان کی نہیں بلکہ **زمیندار** کے ایک زمانے کے ایڈیٹر مولانا عبداللہ عمادی کی ہے ۵۷

شبلی کی رائے میں ''علی گڑھ کو محمد علی کی ذہانت اور ظفر علی خان کی جرات پر ہمیشہ ناز رہے گا ''وہ اپنے اس لائق شاگرد کے کمالات کے کس قدر مداح تھے اس کا اندازہ ان کی اس رائے سے بھی کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے ظفر علی خان کے بارے میں دی انھوں نے کہا کہ:''ظفر علی خان کا نام اور کام محو ہونے کی چیز نہیں ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے لیکن ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کی باگ ڈور نوجوانوں نے سنبھال رکھی ہے''۵۸ شبلی کی توجہ کا مرکز دراصل یہی نوجوان تھے جن سے انھیں مستقبل میں توقعات وابستہ تھیں انھوں نے علی گڑھ میں اپنے آخری خطاب میں بھی انھی نوجوانوں کو مخاطب کیا تھا شبلی کا علی گڑھ میں آخری خطاب بھی خاصے کی چیز ہے انھوں نے بڑے جوش سے طلبائے دارالعلوم کو مخاطب بنا کے فرمایا تھا:

کیے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا
اوراب تو ہیچ یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں
جواں تم ہو لبِ بام آ چکا ہے آفتاب اپنا ۵۹

حقیقت یہ ہے کہ ظفر علی خان اپنے استاد کی امیدوں اور توقعات پر پورے اترے اور انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ قومی خدمت کی وہی راہ اختیار کی جس کے لیے ان کے والد نے ان کی تربیت کی تھی اور شبلی نے

انھیں جس کے لیے تیار کیا تھا۔ ظفر علی خان شہرت و مقبولیت کے ہفت آسماں تک پہنچے لیکن اس کے باوصف انھوں نے اپنی شخصیت کی تشکیل و تکمیل میں اپنے بلند رتبہ استاد کی خدمت کا اعتراف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا اور برملا کہا ؎

یہ فیضِ صحبتِ علامۂ شبلی کا صدقہ ہے
کہ دنیائے ادب میں دھوم ہے میرے مقالوں کی ۶۰

حوالے اور حواشی:

۱۔ علی گڑھ کے دور طالب علمی میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور مولانا حمیدالدین فراہی مولانا ظفر علی خان کے معاصرین تھے اس بات کی تصدیق رپورٹ ترقی تعلیم مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ بابت سال ۹۶۔۱۸۹۵ء مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۶ء تتمہ ضمیمہ نمبر۴ ص۴۴ سے بھی ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ طالب علم فورتھ ایر میں حاجی اسماعیل خان لائل اسکالرشپ لیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی **ذکر فراہی** لاہور: دارالتذکیر ۲۰۰۲ء ص ۱۵۵

۲۔ محمد حمزہ فاروقی ''مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی کا اشتراک علمی'' در **بنیاد** زیر ادارت نجیبہ عارف لاہور: یونیورسٹی آف مینیجمنٹ سائنسز (لمز) ۲۰۱۴ء جلد ۵ ص ۲۱۸

۳۔ سید سلیمان ندوی **مکاتیب شبلی** اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، یو پی طبع جدید ۲۰۱۰ء جلد اول ص ۳۲۸

۴۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی **مکتوبات شبلی** اعظم گڑھ: ادبی دائرہ ۲۰۱۲ء ص۶۴

۵۔ شبلی کی مدح میں ظفر علی خان کا شعر ملاحظہ ہو:

خداوند کریمت لحن داؤدی عطا کردہ
کنی تسخیر دلہا چوکنی تفسیر قرآنی

پورا قصیدہ زیر نظر مضمون میں شامل ہے

۶۔ مطبوعہ روزنامہ **زمیندار** لاہور ۱۶؍فروری ۱۹۳۸ء اس مقام پر ظفر علی خان نے اپنی نظم ''سخنوران عہد سے خطاب'' کے اشعار درج کیے ہیں۔ نظم سخنوران عہد سے خطاب، سرودہ ۱۴؍فروری ۱۹۲۹ء کے لیے دیکھیے: **بہارستان**، لاہورر: مکتبہ کارواں س۔ن ص ۴۷۵

۷۔ ڈاکٹر سید معراج نیر **بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ فن اور شخصیت** لاہور: ادارہ ابلاغ ۱۹۹۵ء ص ۲۸

۸۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام **یادگار شبلی** لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۷۱ء ص ۲۳۰

۹۔ اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا

گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا
وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو ہاں بھی ہوگی ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا
یہ نظم آئیں، یہ طرز بندش سخن وری کیا فسوں گری ہے
کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرزِ علی حزیں کا

شبلی نعمانی **کلیات شبلی اردو** اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی طبع جدید ۲۰۰۷ء ص۱۳

۱۰۔ شاعر کے نام کے طور پر بجائے ظفر علی خان کے ''نقاش'' لکھ دینا زیادہ مناسب سمجھا گیا ؎

بڑھا ہے آگے کو روزِ روشن ہٹی ہے پیچھے کو رات کالی
بچھڑ گیا آسماں کا میلہ ہوئی ستاروں سے بزم خالی

دکن **ریویو** سلسلہ جدید اسلام نمبر سلک دوم ستمبر و اکتوبر جلد اول شمارہ ۱۱، ۱۲ ۱۹۰۷ء ص۸۹ یہ غزل اب **خیالستان** میں شامل ہے طبع جدید لاہور: ظفر علی خان ٹرسٹ ۲۰۱۳ء ص۱۰۳

۱۱۔ سید سلیمان ندوی **حیات شبلی** یعنی شمس العلما علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات اور علمی کارنامے اعظم گڑھ: دارالمصنفین اعظم گڑھ یوپی طبع جدید ۲۰۰۸ ص ۲۱۴

۱۲۔ *History of the Conflict between Religion and Science* by; John William Draper M.D,LL.D Late Professor in the University of New York and author of 'A treatise on human psychology' London 1885

۱۳۔ ظفر علی خان (مترجم) **معرکہ مذہب وسائنس** لاہور: الفیصل ناشران ۱۹۹۵ء ص۵

۱۴۔ ظفر علی خان **ازالۃ الخفا** دوسری قسط روزنامہ **زمیندار** لاہور ۲۴/اپریل ۱۹۲۸ء

۱۵۔ ظفر علی خان در **پنجاب ریویو** جلد ۱ شمارہ ۲ صفحہ ۳۷ بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار **ظفر علی خان ادیب و شاعر** لاہور: مکتبہ خیابان ادب ۱۹۶۷ء ص۴۳

۱۶۔ عبدالحق **چندہم عصر** کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ۲۰۱۰ء ص۷۹

۱۷۔ مثال کے طور پر شبلی کا مقالہ'' تزکِ جہانگیری اور جہانگیر'' جنوری فروری اور مارچ ۱۹۰۴ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا، جنوری ۱۹۰۴ء کے شمارے میں ان کی نظم ''دکن'' شائع ہوئی جون جولائی ۱۹۰۴ء کے شمارے میں ایک بلاعنوان نظم شائع ہوئی۔ نومبر ۱۹۰۷ء دسمبر ۱۹۰۷ء فروری ۱۹۰۸ء کے شماروں میں بھی شبلی کی غزلیں شائع ہوئیں وقس علیٰ ھذا......

۱۸۔ اظہار تشکر میں پہلے تین نام مہاراجہ کشن پرشاد شاد، مولوی عزیز مرزا اور اکبر الہ آبادی کے ہیں۔ ''التماس'' از ایڈیٹر **دکن ریویو** سلسلہ جدید ستمبر ا اکتوبر ۱۹۰۷ء جلد اول نمبر ۱۱۔۱۲ اسلام نمبر سلک دوم صفحہ ''د''

۱۹۔ ظفر علی خان ایڈیٹوریل (بہ سلسلہ **موازنہ انیس و دبیر** اور **ردّالموازنہ**) **دکن ریویو** اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ج تا ح در **شبلی معاصرین کی نظرمیں** مرتبہ: ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی لکھنو: اتر پردیش اردو اکادمی ۲۰۰۵ء ۲۶۷

۲۰ ایضاً ص ۲۶۸

۲۱ ایضاً ص ۲۷۱

۲۲ دیکھیے ہماری کتاب **مکاتیب ظفر علی خان** لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۶ء صص ۶۳ تا ۷۰

۲۳ مکتوب بابائے اُردو بنام عبداللطیف اعظمی در **شبلی نقادوں کی نظر میں** مرتبہ محمد واصل عثمانی کراچی: صفیہ اکیڈمی ۱۹۶۷ء ص ۱۱۹۔۱۲۰

۲۴ پیسہ اخبار یکم دسمبر ۱۹۰۹ء بحوالہ احمد سعید (مرتب) **گفتار ظفر علی خان**، لاہور: ظفر علی خان ٹرسٹ ۲۰۱۵ء ص ۸

۲۵ پندرہ روزہ **نوائے وقت** لاہور ۲۷ ستمبر ۱۹۴۰ء بحوالہ پروفیسر احمد سعید (مرتب) **اقبالیات نوائے وقت** (۱۹۴۰ء تا مارچ ۱۹۴۷ء) لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۲۰۱۵ء ص ۶۳

۲۶ **یادگارِ شبلی** ص ۲۰۴

۲۷ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار **مولانا ظفر علی خان حیات، خدمات و آثار** لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء ص ۳۹

۲۸ شیخ محمد اشرف پبلشرز لاہور

۲۹ Zafar Ali Khan (Translator) ***Al-Farooq Life of Umar the Great*** by Shams-ul-Ulama Allama Shibli Numani Lahore:ShMuhammad Ashraf Publishers 2006 P XVII

۳۰ **مولانا ظفر علی خان حیات، خدمات و آثار** ص ۵۱۵

۳۱ شبلی نعمانی **معرکہ مذہب و سائنس** مصنفہ ڈریپر مترجمہ مسٹر ظفر علی خان بی اے پر ریویو الندوہ جلد نمبر ۷ شمارہ ۸ شعبان المعظم ۱۳۲۸ھ در **مقالاتِ شبلی**ؒ (تنقیدی) جلد چہارم مرتبہ مولانا سید سلیمان ندویؒ، اعظم گڑھ: مطبع معارف ۱۹۵۶ء ص ۱۷۸۔۱۸۸

۳۲ ایضاً

۳۳ بہار پراونشل اردو کانفرنس پٹنہ میں ۲۳ ستمبر ۱۹۲۵ء کو اپنے خطبہ صدارت کے دوران میں مولانا ظفر علی خان نے کہا:

''اس دور کا آخری سال وہ تھا جب علامہ شبلی مرحوم نے **شعر العجم** تصنیف کی اور میں نے ڈاکٹر ولیم جان ڈریپر کی کتاب '**کانفلکٹ بیٹوین ریلیجن اینڈ سائنس**' کا اردو ترجمہ **معرکہ مذہب و سائنس** کے نام سے پایہ اتمام کو پہنچایا پنجاب یونی ورسٹی کا دستور تھا کہ وہ ہر سال اردو کی بہترین تصنیف پر مصنف کو اور بہترین ترجمے پر مترجم کو نقد انعام دیا کرتی تھی چنانچہ مولانا شبلی مرحوم کو **شعر العجم** کے تصنیف کرنے پر پندرہ سو روپیہ اور مجھے **معرکہ مذہب و سائنس** پر پانچ صد روپیہ نقد انعام ملا۔ اس کے بعد اس سلسلے میں یہ ترمیم ہوئی کہ اب یہ انعام باری باری سے بٹتا ہے یعنی ایک سال گورمکھی کے مصنف یا مترجم کو دیا جاتا ہے دوسرے سال ہندی کے مترجم یا مصنف کو اردو کی باری تیسرے سال آتی ہے۔ زبان کی ترقی وترویج کے لیے سرکاری طور پر کسی صلے انعام یا عطیہ کا

دیا جانا از حد ضروری ہے ۔ افسوس ہے کہ پنجاب یونی ورسٹی نے دشمنان اردو کی معاندانہ کوششوں سے متاثر ہو کر اس سے بڑی حد تک ہاتھ کھینچ لیا ہے.................." **زمیندار** ۲/اکتوبر ۱۹۲۵ء بحوالہ گفتار ظفر علی خان ص ۳۱۸

۳۴۔ **مکاتیب شبلی** حصہ اول ص ۳۲۸۔۳۲۹

۳۵۔ سید سلیمان ندوی (مرتب) **کلیاتِ شبلی** اردو شبلی نعمانی، اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی طبع جدید ۲۰۰۷ء ص ۱۴، ص ۶۵۔۶۶

۳۶۔ مولانا ظفر علی خان نے فروری ۱۹۲۰ء کے اس خطاب میں مولانا شبلی کے درج ذیل اشعار اقتباس کیے

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ شرانگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر اس کا ہو گا امتحاں کب تک
یہ مانا ہے فلک سے تم کو شکوہ خشک سالی کا
ہمارے خون سے سینچوگے اپنی کھیتیاں کب تک
عروسِ بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے خون فشاں کب تک
کہاں تک ہم سے لوگے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

مشتاق احمد (مرتب) **خطبات صدارت** فدائے ملت مولانا ظفر علی خان کوٹلہ: قومی دارالاشاعت ۱۹۲۱ء ص ۱۹، ۲۰

۳۷۔ یہ نظم مولانا ظفر علی خان کے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں دیکھیے راقم کی کتاب **ظفر علی خان۔ خطوط وخیوط** لاہور: مسند ظفر علی خان، پنجاب یونی ورسٹی ۲۰۱۲ء ص ۱۶۱

۳۸۔ **مرغزار** ظفر علی خان نمبر، مدیر: عبدالجبار شاکر، شیخوپورہ: گورنمنٹ کالج، ۱۹۸۱ء ص ۲۸۸

برطانوی عہد میں مچھلی بازار کان پور میں واقع ایک مسجد کی شہادت پر مسلمانانِ کان پور نے احتجاج کیا، اوراحتجاجی جلسے کے بعد مسجد کے منہدم حصے کو دوبارہ تعمیر کرنے لگے، اس عمل میں جوانوں کے ساتھ بچے بھی شامل تھے۔ تعمیرِ نو کرنے والوں پر حکام نے بیدردی سے گولیاں چلائیں جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں بچے اور نوجوان شہید ہوگئے۔ ۲/مئی ۱۹۱۲ء کے اس سانحہ پر مولانا شبلی نعمانی نے ذیل کی نظم لکھی، جواس زمانے میں بچے بچے کی زبان پر جاری تھی۔ مولانا ظفر علی خان نے اسی نظم کا انگریزی ترجمہ کیا:

ہم کشتگان معرکۂ کان پور ہیں

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے — دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر — بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر | نیند آ گئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب | ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ | مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار | از بسکہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر | لذت شناسِ ذوق دلِ ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا | جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا | ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

کلیاتِ شبلی اُردو ص۸۴

۳۹ شبلی نعمانی **باقیات شبلی** مکتوب بنام مولوی بشیر الدین لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۵ء ص ۱۶۰
۴۰ **یادگارِ شبلی** ص ۲۳۵
۴۱ **مکتوباتِ شبلی** ص ۶۳۔۶۴
۴۲ ایضاً ص ۱۱۸
۴۳ سید صباح الدین عبدالرحمٰن **مولانا شبلی پر ایک نظر** اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی یوپی ۲۰۰۸ء ص ۵۳
۴۴ **مکتوباتِ شبلی** ص ۴۷
۴۵ یہ شعر صائب کا ہے دیکھیے: **کلیات صائب تبریزی** از روی نسخہ خطی کہ خود شاعر تصحیح نمودہ است، تہران: انتشارات خیام ۱۳۷۳ھ ش غزل نمبر ۹ ص ۴
۴۶ چراغ حسن حسرت کاشمیری **مردمِ دیدہ** لاہور: دارالاشاعت ۱۹۳۹ء
۴۷ **مکتوباتِ شبلی** ص ۶۵۔۶۶
۴۸ زاہد منیر عامر **مولانا ظفر علی خان کتابیات** اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۳ء
۴۹ **مردمِ دیدہ** محولہ بالا
۵۰ سید سلیمان ندوی (مرتب) **مکاتیب شبلی** اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ یوپی ۲۰۱۲ء جلد دوم ص ۳۸
۵۱ **حیاتِ شبلی** ص ۴۶۱
۵۲ یہ قول سید سلیمان ندوی کا ہے دیکھیے: **کلیات شبلی اردو** ص ۱۵
۵۳ **کلیات شبلی اردو** ص ۶۷،۶۸ **حیاتِ شبلی** ص ۴۶۱
۵۴ روزانہ **ہمدرد** دہلی ۵؍جون ۱۹۱۳ء بحوالہ افضل حق قرشی ''نوادرِ شبلی'' در **صحیفہ** شبلی نمبر مدیر افضل حق قرشی لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی۔ دسمبر ۲۰۱۴ء شمارہ ۲۱۸۔۲۱۹ ص ۸۲
۵۵ **مکاتیب شبلی** جلد دوم ص ۱۳۷
۵۶ پروفیسر احمد سعید (مرتب) روزنامہ زمیندار کے **اداریے مقالہ ہائے افتتاحیہ اور شذرات** لاہور: مولانا ظفر علی

خان ٹرسٹ ۲۰۱۴ء

زمیندار کے ۱۹؍جنوری ۱۹۲۳ء کے اداریے میں مولانا شبلی نعمانی کو بہ این الفاظ یاد کیا گیا ہے ......''مولانا شبلی نعمانی نوراللہ مضجعہ نے اپنی زندگی میں جو عظیم الشان علمی اور مذہبی خدمات انجام دیں ان میں دارالمصنفین کی تاسیس ہماری نظر میں سب سے اول نمبر پر آتی ہے ۔ایک بالغ نظر ،روشن دماغ اور محقق عالم کے لیے عمدہ سے عمدہ جاع سے جامع اور سودمند سے سودمند تالیفات و تصنیفات کی ترتیب اگرچہ بجائے خود اس کے ابنائے وطن اور اس کے برادرانِ ملت کے دائمی فخر و ناز کا سرمایہ ہے لیکن دنیا میں اس قسم کے مصنفین اگر زیادہ نہیں رہے تو کم بھی نہیں رہے۔مگر اپنے شروع کیے ہوئے کام کے مستقل اور دائمی اجر اور اپنی قائم کی ہوئی بنیادوں پر عالی شان قصروں کی تعمیر کا اہتمام ایک ایسا نادر کارنامہ ہے جس کی توفیق بہت کم خوش نصیبوں کو ملی ہے'' ص ۴۷

۵۷۔ **صحیفہ** شبلی نمبر ص ص ۶۳۹۔۶۴۴

۵۸۔ **ظفرعلی خان ادیب و شاعر** ص ۱۱۵

۵۹۔ مدیر الندوہ: **الندوہ** نومبر ۱۹۱۴ء جلد ۱۰ ش ۵ ص ۲۴۔۲۸ **در شبلی معاصرین کی نظر میں** ص ۱۴۶

۶۰۔ نظم'' دارا پور'' سرودہ در جہلم ۱۹۴۰ء ظفرعلی خان **چمنستان** لاہور: پبلشرز یونائیٹڈ ۱۹۴۴ء ص ۲۷۷ فیض اور صحبت کا اکٹھا استعمال باعث تعجب ہے۔شاید فیضِ صحبت کہا ہو......؟

...................................انتہا...................................